مولانا انیس الرحمٰن ندوی*

بھارت میں تین طلاق کے متعلق سپریم کورٹ کا فیصلہ ایک تجزیہ

سپریم کورٹ کی پانچ رکنی بنچ نے اپنے ۲۲ اگست ۲۰۱۷ کے فیصلہ میں تین طلاق کو منسوخ کر کے حکومت کو چھے ماہ کے اندر اس سلسلے میں نیا قانون بنانے کا حکم دیا ہے۔ پانچ ججوں کی بنچ میں سے تین ججوں نے منسوخی کے حق میں اور دو ججوں نے اس کی مخالفت میں اپنا فیصلہ سنایا۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ تین طلاق ایک انتہائی شنیع اور گھناؤنا عمل ہے۔ مگر اسلام نے محض ناگزیر اور اضطراری حالات سے بچنے کے لئے اس کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔ اس کے باوجود اگر مسلم معاشرہ میں اس کا غلط استعمال ہو رہا ہے تو اس کو روکنے کے کئی راستے موجود ہیں جن میں سے ایک وہ ہے جس کو خود سپریم کورٹ نے اپنے گزشتہ فیصلہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کو تلقین کی تھی کہ وہ ہندوستان کے تمام دار القضاؤں اور مساجد کے تحت انجام پانے والی شادیوں کے نکاح ناموں میں تین طلاق کی شق کو داخل کرے، اور عورت کو اسکے قبول اور عدم قبول کا مکلّف بنائے۔ اسکا دوسرا طریقہ بعض حلقوں کی جانب سے یہ تجویز کیا گیا کہ بغیر کسی عذر کے تین طلاق دینے والوں کا سماجی بائیکاٹ کیا جائے۔ حضرت عمرؓ تین طلاق دینے والوں کی ہمت شکنی کرنے کیلئے انہیں تادیبا کوڑے مارا کرتے تھے۔ اس سلسلے میں اور بھی مناسب طریقوں اور قانون سازیوں (مثلاً سزا اور بھاری جرمانہ) سے اس رواج کو روکا جاسکتا تھا جس کی نظیریں خود اسلامی قانون میں موجود ہیں مگر عدالتِ عظمیٰ نے ایسا نہ کر کے تین طلاق ہی کو کالعدم قرار دے دیا۔ لہٰذا سپریم کورٹ کا یہ فرمان ایک طرف مسلم پرسنل لاء میں کھلی ہوئی مداخلت ہے تو دوسری طرف اس سے مسلمانوں کو عمل حرام پر مجبور کرنا لازم آتا ہو۔ لہٰذا اس سلسلے میں ہمارا یہ ماننا ہے کہ عدالتِ عظمیٰ کا مقصد یعنی تین طلاق کی روک تھام ضرور قابل تحسین ہے مگر اسکے حصول کا طریقہ نامناسب اور غیر شرعی ہے۔

---

* جنرل سکریٹری، فرقانیہ اکیڈمی وقف، بنگلور

سپریم کورٹ کے فیصلہ پر ایک نظر

تین طلاق کے متعلق عدالت عظمیٰ کی پانچ ججوں کی آئینی بنچ کے فیصلہ کے بالاستیعاب مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک متضاد فیصلہ ہے جس میں ایک طرف تین ججوں (جسٹس کورین جوزف، جسٹس نریمان اور جسٹس للت) نے تین طلاق کی منسوخی کے حق میں اور دو ججوں (چیف جسٹس کھیہر اور جسٹس عبد النذیر) نے اس کی مخالفت میں فیصلہ صادر کیا، تو دوسری طرف پانچ میں سے تین ججوں نے یہ بھی مانا کہ ہر مذہب والوں کو اپنے پرسنل لاء پر عمل درآمد ہونے کا مکمل حق حاصل ہے۔ اس میں عدالتوں کو مداخلت کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

عدالت عظمیٰ کا یہ پورا فیصلہ ۳۹۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں چیف جسٹس کھیہر نے اپنے ۲۷۲ صفحات پر مشتمل فیصلہ میں کہا کہ پرسنل لا آئین ہند کی دفعہ ۲۵ اور ۴۴ میں دی گئی مذہبی آزادی کے تحت آتا ہے (ص ۲۶۵)، جس کی حفاظت کرنا عدالتوں کا فرض ہے۔ عدالتوں کو پرسنل لاز میں خواہ مخواہ غلطیاں تلاش کرنے کا حق نہیں ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ مذہب کا تعلق عقیدے سے ہے عقل و منطق سے نہیں۔ اور یہ کہ کسی بھی مذہب کی تفہیم میں اعتبار اس کے ماننے والوں کے فہم کے مطابق ہونا چاہئے۔ جسٹس کھیہر کا اتنا کہنا تو درست تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے حکومت کو اس سلسلے میں قانون سازی کی دعوت بھی دے کر خود اپنی ہی بات نفی کر ڈالی جو ان کا ایک کھلا ہوا تضاد ہے۔ جسٹس عبد النذیر نے جسٹس کھیہر کے فیصلے کی تائید کی۔

جسٹس نریمان نے اپنے ۹۶ صفحات کے فیصلے میں کہا کہ چونکہ یک مشت تین طلاق سے قرآن میں بیان کردہ مصالحت کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند ہوجاتے ہیں اس لئے اس کو تحفظ فراہم نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہ کہ تین طلاق دستور کے آرٹیکل ۱۴ میں دئے گئے بنیادی حقوق کے خلاف ہے (ص ۳۵۴)۔ ان کا یہ بھی ماننا تھا کہ طلاق ثلاثہ شریعت کا لازمی جز نہیں ہے۔ جسٹس للت کی بھی یہی رائے رہی۔

جسٹس کوریان نے اپنے ۲۶ صفحات کے فیصلے میں مذہبی آزادی کو دستوری حق مانا مگر انہوں نے تین طلاق کو شریعت کا لازمی جز ماننے سے انکار کردیا۔ ان کی دلیل تھی کہ قرآن میں کہیں بھی تین طلاق کا تذکرہ موجود نہیں ہے۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ جو چیز مذہبی اعتبار سے بُری ہو اس کو قانونی اعتبار سے جائز نہیں ہونا چاہئے۔ ان کے مطابق دستور کی دفعہ ۲۵ کی تحت مذہبی آزادی حق مساوات اور دیگر بنیادی حقوق کے ساتھ عدم تصادم کے ساتھ مشروط ہے۔ مندرجہ ذیل سطور میں ہم ان فاضل ججوں کے اٹھائے گئے بعض نکات کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔

اسلام میں نکاح ایک سماجی معاہدہ

اسلام میں نکاح میاں اور بیوی کے درمیان ایک سماجی معاہدہ contract ہے۔ لہٰذا میاں اور بیوی کو اس کا انٹرنیٹ میں باہم رضامندی کے ساتھ شرائط طے کرنے اور ان میں تصرف کا پورا حق حاصل ہے۔ اس میں میاں اور بیوی کوئی بھی شرط (بشمول طلاق ثلاثہ) باہمی رضامندی کے ساتھ قبول یا رد کر سکتے ہیں۔ کوئی بھی تیسرا شخص (تھرڈ پارٹی) اس میں مداخلت کا مجاز نہیں ہے۔ اگر مؤثر طریقے سے نکاح کے اس تصور کو صحیح طور پر نافذ کیا جائے تو طلاقِ ثلاثہ کا پورا جھگڑا یہیں ختم ہوسکتا ہے۔ لہٰذا سپریم کورٹ کا حالیہ فیصلہ جہاں شریعت میں کھلی ہوئی مداخلت ہے وہیں یہ نکاح کے اسلامی تصور کی اسپرٹ کے خلاف ہے۔

طلاقِ ثلاثہ رواج ہے یا منصوص حکم

عدالتِ عظمیٰ کے بعض فاضل ججوں کا زور اس پر رہا کہ طلاقِ ثلاثہ قرآن اور حدیث سے ثابت نہیں بلکہ یہ ایک رواج ہے جس کے موجد حضرت عمرؓ ہیں جنہوں نے اپنے انتظامی فرمان کے ذریعہ تین طلاق کو ایک کے بجائے تین قرار دیا۔ اس مسئلہ پر اب تک بہت کچھ لکھا جاچکا ہے کہ طلاق ثلاثہ ایک منصوص حکم ہے وہ کسی بندے کی ایجاد نہیں ہے۔ پھر بھی یہاں اس کا اختصار پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس سلسلے میں کسی کو بھی تردد باقی نہ رہے۔

قرآن مجید میں تذکرہ صرف طلاق احسن کا ہے (بقرہ: ۲۲۹) اور طلاق دینے کا سب سے اچھا طریقہ یہی ہے۔ سورۂ بقرہ کی اسی آیت میں آگے تاکید کی گئی ہے کہ وہ حد سے تجاوز نہ کریں ورنہ ان کا شمار ظالمین میں ہوگا۔ لہٰذا کبار ائمہ نے اس سے بطور اقتضاء النص یہ مفہوم اخذ کیا ہے کہ اس سے بیک وقت تین طلاق دینا مراد ہے ورنہ اس کے ارتکاب کے باوجود کوئی بھی شخص ظالم نہیں ہوسکتا۔

جہاں تک احادیث کا تعلق تو صحاح ستہ سمیت مختلف حدیث کی کتابوں میں درجنوں احادیث وارد ہوئی ہیں جن سے بیک وقت دی ہوئی تین طلاقوں کا ثبوت ملتا ہے، اور وہ بھی نبی کریم ﷺ کے دور میں۔ صحیح بخاری میں ایک حدیث مروی ہے کہ ایک صحابی عویمر عجلانی نے اپنی بیوی پر تہمت لگائی تو قرآنی فیصلے کے مطابق رسول اللہ نے ان دونوں کو ایک دوسرے پر لعنت کرنے کا حکم دیا جب میاں بیوی اس سے فارغ ہوئے تو عویمر نے رسول اللہ ﷺ کے حکم کرنے سے پہلے ہی اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں (بخاری: ۵۲۵۹) بخاری ہی میں حضرت عائشہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں اس عورت نے دوسرے مرد سے نکاح کرلیا۔ پھر اس نے بھی اس کو طلاق دے دی تو نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا اب اس عورت کو پہلے مرد سے نکاح درست ہے تو آپ نے فرمایا نہیں جب تک کہ

دوسرا مرد اس سے ہمبستری نہ کرلے وہ پہلے مرد سے نکاح نہیں کرسکتی۔ (بخاری: ۵۲۶۱) اسی طرح کا واقعہ ایک صحابیہ رفاعہ قرظی کیساتھ پیش آیا تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے پہلے شوہر سے شادی کی اجازت مانگی تو آپ نے ان کو بھی وہی حکم دیا۔ (بخاری: ۵۲۶۰) امام بخاری نے یہ تینوں حدیثیں تین طلاق کے جواز کے باب کے تحت درج کی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے خود ان کا مسلک بھی ایک مجلس کی تین طلاق کے جواز کا تھا۔

ابن ماجہ نے فاطمہ بنت قیس کی روایت نقل کی ہے کہ انکے شوہر نے یمن جاتے وقت انہیں تین طلاقیں دے دیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نافذ کردیا۔ (ابن ماجہ: ۲۰۲۴) سنن نسائی میں محمود بن لبید سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں تو آپ غضب ناک ہو کر کھڑے ہوگئے اور فرمایا کہ کیا کتاب اللہ کے ساتھ کھیلا جائے گا جبکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔ (نسائی: ۳۴۰۱) اس کا بھی مطلب یہ ہوا کہ یہ تینوں طلاقیں واقع ہوگئی، ورنہ اگر تین سے صرف ایک مراد ہوتی تو اس پر آپ ﷺ کے اسقدر غضبناک ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس سلسلے کی ایک اور حدیث 'حدیث رکانہ' ہے۔ رکانہ نے اپنی بیوی کو 'طلاق البتہ' دی۔ آپ ﷺ نے رکانہ کو قسم دے کر پوچھا کہ طلاق البتہ سے ان کی نیت کیا تھی ایک یا تین کی۔ جب انہوں نے کہا کہ اس سے ان کی نیت ایک کی تھی تو آپ ﷺ نے ان کی بیوی ان کو لوٹا دی۔ (ابو داؤد وابن ماجہ) یہاں بھی واضح ہے کہ اگر یہاں پر تین طلاقیں بیک وقت واقع نہ ہوتیں تو پھر آپؐ رکانہ سے اس طرح تفصیل دریافت نہیں کرتے اور قسم نہیں کھلاتے بلکہ صاف فرمادیتے کہ ایک ہی واقع ہوئی ہے۔

ملاحظہ فرمائیں کہ ایک مجلس کی تین طلاق کے مذکورۂ بالا تمام واقعات خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں آپ ﷺ کی موجودگی میں واقع ہوئے ہیں، جس پر آپ ﷺ کے تفصیلی فرامین بھی موجود ہیں کہ آپؐ نے انہیں نافذ فرمایا۔ آپؐ کے بعد صحابہ کرام بھی اسی مسلک پر عمل پیرا رہے۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔ ایک شخص نے حضرت ابن عباسؓ سے دریافت کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو ایک سو طلاقیں دی ہیں تو آپ کی کیا رائے ہے؟ آپؓ نے کہا کہ تیری تین طلاقیں تو تیری عورت پر واقع ہوگئیں اور بقیہ ۹۷ کے ذریعہ تو نے اللہ کی آیات کا مذاق اڑایا ہے۔ (مؤطا امام مالک) ایک شخص عبداللہ بن مسعود کے پاس آیا اور عرض کیا کہ میں نے اپنی بیوی کو آٹھ طلاقیں دے دی ہیں (تو اس بارے میں کیا حکم ہے؟) آپ نے پوچھا کہ (اس مسئلے میں اہل علم) لوگوں نے تجھ سے کیا کہا ہے؟ وہ بولا کہ مجھ سے کہا گیا کہ تمہاری بیوی تم سے بائن (جدا) ہوگئی؟ آپ نے فرمایا کہ انہوں نے سچ کہا۔ (مؤطا مالک) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ

دور صحابہ میں بیک وقت ایک سے زیادہ طلاق دینے کی صورت میں وہ تمام لوگوں کے نزدیک واقع ہوجاتی تھیں۔ صحابہ اور تابعین میں اس میں کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا۔

کتب حدیث میں مزید درجنوں صحیح احادیث موجود ہیں جن سے بیک وقت تین طلاق کی قطعیت کا ثبوت ملتا ہے جن سے طوالت کے خوف سے اجتناب کیا جارہا ہے۔ بعض لوگ ایک مجلس کی تین طلاق کے نفاذ کو حضرت عمر کے انتظامی فرمان میں شمار کرتے ہیں۔ ان کا استدلال اس حدیث سے ہے: ''جو ابن طاؤس سے مروی ہے کہ ابوصہباء نے ابن عباسؓ سے دریافت کیا: کیا آپ جانتے ہیں کہ عہد رسالت وابوبکر اور خلافت عمر کے تین سالوں تک تین کو ایک قرار دیا جاتا تھا؟ ابن عباس نے کہا: ہاں'' (مسلم: ۱۴۷۲؛ ابوداؤد: ۲۲۰۰؛ نسائی وبیہقی) ظاہر ہے یہ حدیث اوپر مذکور عہد رسالت اور عہد صحابہ کے واقعات کے بالکل منافی دوسرا حکم بیان کررہی ہے۔ اس حدیث کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی حدیث اسی راوی (ابن طاؤس) سے ابوداؤد اور بیہقی میں ایک اور جگہ مروی ہے جس میں یہ زائد الفاظ مروی ہیں کہ یہ بات اس منکوحہ کے بارے میں ہے جو کہ ابھی غیر مدخولہ ہے۔ (ابوداؤد: ۲۱۹۹) لہٰذا قرینِ قیاس یہی ہے کہ حضرت عمر کی طرف منسوب یہ بات منکوحہ غیر مدخولہ عورت کے متعلق ہے۔ ورنہ ایک تابعی (ابن طاؤس) کی روایت سے اتنے سارے صحابہ سے مروی روایات کو رد نہیں کیا جاسکتا۔

لہٰذا صحاح ستہ کے اکثر مصنفین سمیت کبار محدثین کا مسلک بھی یہی ہے کہ بیک وقت دی ہوئی تین طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں۔ فقہاء میں بہت کم کسی مسئلہ پر تمام ائمہ کا مکمل اتفاق ہوتا ہے مگر طلاق ثلاثہ کے متعلق ائمہ اربعہ یعنی امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ اور جمہور فقہاء کا اتفاق ہے کہ اس سے تین طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں۔ لہٰذا طلاق ثلاثہ کے وقوع پر پوری امت کا اجماع ہے جو صحابہ اور تابعین کے دور سے چلا آرہا ہے۔ علامہ ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن قیمؒ جو تین طلاق کو ایک مانتے تھے خود انہوں نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ جمہور صحابہ، تابعین اور فقہاء کا قول یہی ہے: ''یہ قول مالک، ابوحنیفہ، احمد اور شافعی کا ہے جو اکثر صحابہ اور تابعین سے مروی ہے۔'' (فتاویٰ ابن تیمیہ: ۳۳/۸؛ زاد المعاد: ۲۴۷/۵) لہٰذا اس کو حضرت عمرؓ کا انتظامی فرمان قرار دینا آپؓ جیسے جلیل القدر صحابی پر بہت بڑا اتہام ہے۔ (ملاحظہ ہو: تین طلاق کا ثبوت، علامہ محمد شہاب الدین ندویؒ، مطبوعہ فرقانیہ اکیڈمی وقف)

تین طلاق کی حکمتیں

اس میں کوئی شک نہیں کہ تین طلاق کے عمل کو شریعت میں حرام اور واجب گناہ قرار دیا گیا ہے مگر اس کے باوجود اسلامی شریعت میں اس کو قابل اعتبار بھی مانا گیا ہے۔ تین طلاق ہی کیوں خود نفس طلاق

(بشمول طلاق احسن اور طلاق حسن) اللہ کے نزدیک تمام حلال اشیاء میں سب سے مبغوض اور ناپسندیدہ عمل قرار دیا گیا ہے (سنن ابوداؤد: ۲۱۷۸؛ ابن ماجہ: ۲۰۱۸) مگر کیا اس کے باوجود طلاق ایک معاشرتی ضرورت اور انسان کا فطری حق نہیں ہے؟ بلکہ بہت سے مواقع پر وہ باعث رحمت بھی ہے۔ لہذا جس طرح نفس طلاق مباح ہے اسی طرح طلاق ثلاثہ بھی بعض انتہائی ناگزیر حالات میں مباح قرار دیا گیا ہے۔

ممکن ہے بعض لوگوں کو اس سے اختلاف ہو مگر طلاق ثلاثہ یا instant talaq بھی بعض ناگزیر حالات میں ضروری معلوم ہوتی ہے۔ بالخصوص ہندوستان جیسے ملکوں میں جہاں عورتوں پر مظالم دنیا کے دوسرے ممالک کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوتے ہیں اور جن سے ازدواجی طور پر چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے انہیں موت کی ابدی نیند سلا دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے اضطراری حالات اور حادثات کی روک تھام کے لئے فوری طلاق بھی مسئلہ کا ایک حل ہوسکتا ہے۔ جس کے ذریعہ بہت ساری انسانی جانوں کو بچایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کے ایک اضطراری واقعہ کا ذکر احادیث میں ملتا ہے۔ یہ بخاری میں مذکور وہی عویمر عجلانی ہی کی روایت ہے جس کو اوپر بیان کیا گیا ہے کہ عویمر عجلانی نے اپنی بیوی پر تہمت لگائی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر فرمایا یا رسول اللہ! اس شخص کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جس نے اپنی بیوی کو کسی دوسرے مرد کے پاس پایا ہو کہ اگر وہ (شوہر) اس (بیوی) کو قتل کردے تو آپ بھی اس (شوہر) کو دیت کے طور پر قتل کردیں گے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی فیصلے کے مطابق ان دونوں میاں بیوی کو ایک دوسرے پر لعنت کرنے کا حکم دیا۔ جب میاں بیوی اس سے فارغ ہوئے تو عویمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کرنے سے پہلے ہی اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں (بخاری: ۵۲۵۹)۔ اس حدیث میں مذکور واقعہ میں تین طلاق کی مشروعیت کے متعلق ہمارے ذہنوں میں اٹھنے والے تمام سوالات واشکالات کا جواب موجود ہے۔

فقہ اسلامی کا ایک اصول اخف الضررین ہے، جس کا مطلب ہے اضطراری اور مجبوری کی حالت میں دو ممنوع اشیاء میں سے کم نقصان اور ضرر والی شئ کو اختیار کرنا۔ لہٰذا طلاق ثلاثہ کی حرمت کے باوجود اس کے وقوع کو مباح رکھنا قرین قیاس ہے کہ اسی اصول کے تحت ہو۔

بسا اوقات طلاق واجب بھی ہوجاتی ہے۔ فقہاء کے مطابق طلاق واجب اس وقت ہوتی ہے جب میاں بیوی کے جھگڑے میں فیصلہ کرنے والے ثالثوں کی رائے یہ ہو کہ ان کے درمیان کوئی خیر کی امید نہیں ہے بلکہ ان دونوں کو جلد از جلد الگ کردینا ہی بہتر ہے۔ یا میاں بیوی دونوں رضامندی سے فوری طور پر الگ ہونا چاہتے ہوں، اور ان دونوں کو مزید وقت تک ملا کر رکھنے میں طرفین کو مالی، جانی یا جسمانی

نقصان کا خطرہ ہو تو ایسی تمام صورتوں میں فوری طلاق حرمت اور کراہت کے باوجود ضروری ہو جاتی ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو اسلام کا کوئی بھی قانون زائد یا غیر ضروری نہیں ہے بلکہ اس کے تمام قوانین میں انسانی معاشرہ میں رائج ہر قسم کی برائیوں کا حل پوشیدہ ہے۔

ہندوستان میں شادی شدہ افراد کی خودکشیاں

اسلام میں مشروع طلاق ثلاثہ یا فوری طلاق کی افادیت واہمیت کو ہندوستانی سماج کی موجودہ صورتحال کے تناظر میں بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے، جہاں شادی شدہ افراد کی خودکشی کا معاملہ انتہائی سنگین شکل اختیار کر چکا ہے۔ نیشنل کرائم ریکارڈز بیورو (این سی آر بی) نے بھارتی سماج میں شادی شدہ مردوں اور عورتوں میں خودکشی کے رجحان کے جو اعداد وشمار پیش کئے ہیں وہ انتہائی چونکانے والے ہیں۔ ہمارے سامنے ۲۰۰۱ سے ۲۰۱۲ کے اعداد وشمار ہیں جو حسب ذیل ہیں:

جدول ۱: بھارت میں شادی شدہ مرد اور خواتین میں خودکشی کے اعداد وشمار

سال	عورت	مرد	مجموعی
۲۰۰۱	۲۷،۶۷۰	۴۵،۹۳۲	۷۳،۶۰۲
۲۰۰۲	۲۶،۵۵۱	۴۷،۵۲۷	۷۴،۰۷۸
۲۰۰۳	۲۷،۱۸۲	۴۸،۶۵۶	۷۵،۸۳۸
۲۰۰۴	۲۷،۵۷۱	۵۰،۷۳۱	۷۸،۳۰۲
۲۰۰۵	۲۷،۷۲۷	۵۰،۵۷۳	۷۸،۳۰۰
۲۰۰۶	۲۹،۴۲۵	۵۴،۴۳۷	۸۳،۸۶۲
۲۰۰۷	۲۹،۶۰۲	۵۶،۵۴۰	۸۶،۱۴۲
۲۰۰۸	۲۹،۷۰۳	۵۶،۷۳۴	۸۶،۴۳۷
۲۰۰۹	۳۰،۷۵۰	۵۷،۱۹۵	۸۷،۹۴۵
۲۰۱۰	۳۱،۱۵۹	۶۰،۴۴۹	۹۱،۶۰۸
۲۰۱۱	۳۲،۵۱۷	۶۲،۴۳۳	۹۴،۹۵۰
۲۰۱۲	۳۱،۹۹۲	۶۳،۳۴۳	۹۵،۳۳۵

واضح رہے مذکورۂ بالا اعداد وشمار شادی شدہ مرد اور خواتین کی خودکشیوں کے ہیں۔ ان میں قتل، غیر فطری اموات، جہیز ہراسانی وغیرہ کی اموات اور وقیت یا مستقل معذوری disability کے واقعات شامل نہیں ہیں۔ این سی آر بی کی اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ بھارت میں شادہ شدہ مرد اور خواتین کی خودکشیوں کا سب سے بڑا سبب گھریلو مسائل ہیں۔ خودکشی کے مذکورۂ بالا واقعات میں ہر سال ۴-۵ فیصد اضافہ ہو رہا ہے۔ جیسا کہ اس رپورٹ سے معلوم ہو رہا ہے کہ خودکشی کا تناسب عورتوں کے مقابلے میں

مردوں میں دوگنا ہے۔مختلف سرویس میں مردوں میں خودکشی کی اس زیادتی کے لئے جن اسباب کو ذمہ دار قرار دیا گیا ہے ان میں مرد کے خلاف انتہائی سخت قوانین کا پایا جانا ہے، جن میں جہیز ہراسانی، گھریلو تشدد اور شادی کے ۷ سال کے اندر بیوی کی غیر فطری موت کے قوانین ہیں جو اس قدر سخت ہیں کہ اس کی وجہ سے مرد اور اس کے تمام اہل خانہ کو تفتیش کے بغیر حوالات میں بند رہنے، شوہر کا اپنی پوری جائیداد سے ہاتھ دھو بیٹھنے یا ایک طویل مدت تک شوہر اور اس کے اہل خانہ کو قید و بند کے صعوبتیں برداشت کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔کریمنل پروسیجر کوڈ کی دفعہ ۱۲۵ کے تحت صرفِ نظر اس کہ غلطی کس کی ہے مرد اپنی بیوی کی تاحیات کفالت کا ذمہ دار ہے۔ان اعداد وشمار میں مزید اس کے انکشافات کئے گئے ہیں کہ طلاق کے بعد یا بیوی کے انتقال کے بعد ان شادی شدہ مردوں میں خودکشی کا رجحان انتہائی کم ہوگیا ہے۔(ٹائمز آف انڈیا: ۲۶ جولائی) دوسری طرف بھارتی قوانین کے تحت طلاق کے حصول کے لئے اسقدر سخت شرائط ہیں کہ ہر کس وناکس طلاق کی اپیل کی استطاعت نہیں رکھتا، اور جو اس کی ہمت کرے اس کیلئے بھی اس کے حصول کے لئے عام حالات میں پانچ سال یا اس سے بھی زیادہ کا عرصہ لگ سکتا ہے۔لہٰذا واقعہ یہ ہے کہ بھارت میں ازدواجی زندگی اگر مسائل کے بغیر کامیابی سے چل گئی تو چل گئی ورنہ یہی شادی میاں اور بیوی کیلئے عذاب بن جاتی ہے جس سے چھٹکارا حاصل کرنے کیلئے وہ ایسا انتہائی اقدام کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔

بہرحال یہ اعداد وشمار حکومت، عدلیہ اور ہمارے نادان دانشوروں کے لئے ایک لمحہءفکریہ اور تنبیہ ہیں کہ اگر مسائل میں الجھے ہوئے اور ناکارہ ازدواجی رشتوں کو فوری یا جلد ختم کرکے انہیں راحت نہیں دی گئی اور انہیں نئے سرے سے زندگی گزارنے کا ایک مزید موقع جلد فراہم نہیں کیا گیا تو اس کے کسقدر سنگین نتائج نکل سکتے ہیں۔

طلاق ثلاثہ کا مسئلہ کتنا سنگین ہے؟

یہاں یہ سوال بھی اہمیت کا حامل ہے کہ کیا طلاق ثلاثہ کا رواج مسلم معاشرہ میں واقعی اسقدر سنگین ہے جتنا سنگین بنا کر اس کو میڈیا اور حکومت پیش کررہے ہیں۔اس سلسلے میں سی آر ڈی ڈی پی CRDDP نامی ایک غیر حکومتی ادارے کے سروے کے ذریعہ جمع کئے گئے اعداد وشمار کافی اہم ہیں جس میں دکھایا گیا ہے کہ مسلمانوں میں تین طلاق کا رواج انتہائی کم یا نہ ہونے کے برابر ہے۔سی آر ڈی ڈی پی نے بیس ہزار سے زائد افراد سے جوابات طلب کئے۔اس نے طلاق کے ۳۱۳ قضیوں کا تجزیہ کیا اور حسب ذیل اعداد وشمار پیش کئے: طلاق کے ان واقعات میں ۲ء۳۶ فیصد طلاقیں سنت طریقہ (طلاق احسن اور حسن) کے ذریعہ، ۷ء۲۴ فیصد قاضیوں اور دارالقضاؤں کے ذریعہ، ۱ء۲۱ فیصد کورٹوں/ نوٹسوں کے ذریعہ، ۹ء۱۶ فیصد اداروں/ پولیس/ پنچایتوں کے ذریعہ اور صرف ۳ء۰ فیصد (یعنی ۳۱۳ میں صرف ایک) تین طلاق کے ذریعہ

واقع ہوئی ہیں۔ ۲۰۱۱ کی سنسس رپورٹ کے مطابق بھارت میں مسلمان مطلقہ عورتوں کی تعداد ۲ء۱۲ لاکھ ہے۔ اس میں اگر ۳ء۰ فیصد کے تناسب سے طلاق ثلاثہ کے کل واقعات کا حساب لگایا جائے تو بمشکل ۷سو واقعات طلاق ثلاثہ کے نکلیں گے۔ ظاہر ہے طلاق ثلاثہ کا پورا معاملہ رائی کو پہاڑ بنانے کے مترادف ہے۔ جبکہ دوسری طرف برادران وطن میں شادی کی تلخیوں سے جلد راحت نہ ملنے کی وجہ سے سالانہ لاکھوں افراد خودکشی کررہے ہیں مگر میڈیا میں اس پر کوئی چرچا نہیں ہوتا اور نہ یہ حکومت اور عدلیہ کو جھنجوڑنے کیلئے کافی سمجھے جاتے ہیں۔ لہٰذا حکومت اور میڈیا کھرے کو کھوٹا اور کھوٹے کو کھرا ثابت کرنے پر بضد ہیں۔

کیا کوئی عمل گناہ بھی ہوسکتا ہے اور مذہبی بھی؟

سپریم کورٹ کے فیصلہ میں بعض ججوں نے یہ کہا ہے کہ ''جو گناہ ہے وہ مذہبی نہیں ہوسکتا'' ایک اور جگہ ہے ''وہ عمل جو خدا ہی کی نظر میں مکروہ اور گھناؤنا ہو اس کو انسان کیسے جائز ٹھہرا سکتا ہے'' (ص ۱۸۸) لہٰذا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ 'تین طلاق' گناہ بھی ہو اور مذہبی بھی ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ تین طلاق شرعا حرام اور واجب گناہ فعل ہے مگر جہاں تک اس کے واقع ہونے کا تعلق ہے تو وہ نافذ ہوجاتی ہے۔ شرعی وعقلی دونوں اعتبار سے اس کا نفاذ درست ہے۔ شرعا اس طرح کہ جب کسی فعل پر قرآن یا حدیث سے کوئی حکم منصوص طور پر ثابت ہوجائے تو پھر اس مسئلہ پر بے جا چوں وچرا کرنا اور عقلی گھوڑے دوڑانا جائز نہیں ہے بلکہ اس کو من وعن قبول کرنا ضروری ہے۔ عقلی اور قیاسی اعتبار سے اس طور پر کہ کسی فعل کے حرام یا غیر شرعی ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ اس کا وجود ہی نہیں ہے یا وہ مفقود ہے۔ دنیا میں ایسا کوئی گناہ نہیں ہے جو گناہ بھی ہو اور واقع بھی نہ ہوتا ہو۔ بلکہ کسی فعل کی حرمت کے لئے اس کا وجود ضروری ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں جب کوئی فعل واقع ہوگا تب ہی اس کی حلت یا حرمت ثابت ہوگی ورنہ نہیں۔ اگر بالفرض یہ مان بھی لیا جائے کہ حرام کے ارتکاب سے حرام واقع نہیں ہوتا ہے تو پھر یہ ماننا کیسے درست ہوسکتا ہے کہ اس حرمت کے ارتکاب سے پورا نہیں بلکہ ایک تہائی حرام واقع ہوگا دو تہائی نہیں؟ جیسا کہ تین طلاق کو ایک ماننے والوں کا کہنا ہے۔ لہٰذا ان کی یہ عقلی دلیل خود ان کے خلاف پڑتی ہے۔ قرآن اور حدیث میں اس طرح کے اور بھی احکام ملتے ہیں جو حرام ہونے کے باوجود واقع ہوجاتے ہیں۔ ان کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں۔

جس طرح اسلامی شریعت میں تین طلاق کو بیک وقت دینے سے منع کیا گیا ہے اسی طرح ''ظہار'' (اپنی بیوی کو اپنی ماں یا کسی بھی محرم عورت سے تشبیہ دینے) سے بھی روکا گیا ہے۔ اور اسے قرآن میں 'منکر' اور 'جھوٹ' سے تعبیر کیا گیا ہے (مجادلہ: ۲) مگر اس کے باوجود ظہار کرنے والا شخص جھوٹ کا مرتکب ہوتا ہے اور سزا سے بھی نہیں بچ سکتا بلکہ اس پر کفارہ لازم آتا ہے۔ تین طلاق بھی اسی طرح حرام ہونے

کے باوجود واقع ہوتی ہے۔اس کی دوسری مثال مرتد ہوجانے (اسلام سے خارج ہوجانے) کی ہے۔مرتد ہوجانا اللہ کی صریح نافرمانی کرنا اور حرام کا ارتکاب کرنا ہے۔مگر اس کے ارتکاب سے وہ شخص دائرہ اسلام سے خارج بھی ہوجاتا ہے اور اس کی بیوی اس سے جدا بھی ہوجاتی ہے (یعنی اس کا نکاح ٹوٹ جاتا ہے) تین طلاق کا وقوع بھی اسی طرح ہے کہ وہ باوجود حرام ہونے کے واقع ہوجاتی ہیں۔

اگر سپریم کورٹ کے فاضل ججوں کی منطق کو قبول کیا جائے جو خلاف قیاس اور خلاف عقل بھی ہے تو صرف تین طلاق ہی نہیں بلکہ ظہار اور ارتداد سمیت اسلامی شریعت کے بہت سارے احکام اس کی زد میں آئیں گے اور شریعت کا بڑا حصہ قابل دست انداز ہوجائے گا۔

مساوات اور عدل میں فرق

سپریم کورٹ کے حکم نامہ میں بعض ججوں نے طلاق ثلاثہ کو دستور کی دفعہ ۱۴ میں بیان کردہ بنیادی حق 'حق مساوات' کے منافی قرار دیا ہے۔اس میں شک نہیں کہ اسلام نے سماجی حقوق اور ذمہ داریوں کی تقسیم کی بنیاد مساوات equality پر نہیں بلکہ عدل justice پر رکھی ہے۔کیونکہ مساوات سماجی انصاف کا ضامن نہیں ہوتا بلکہ عدل میں انصاف کی ضمانت پوشیدہ ہوتی ہے۔یعنی کہ عدل میں مساوات سے اونچے درجہ کا انصاف پوشیدہ ہوتا ہے۔اس کو سمجھنے کے لئے پہلے مساوات اور عدل کے درمیان فرق کو سمجھنا ہوگا۔

مساوات میں یہ فرض کرلیا جاتا ہے کہ تمام افراد مساوی ہیں اور وہ سب ایک ہی قسم کی صلاحیتوں اور قابلیتوں کے مالک ہیں جبکہ یہ مفروضہ خود اصول فطرت کے خلاف ہے۔اس مفروضہ کے تحت طاقتور، کمزور اور معذور تمام کو مساوی حقوق عطا کئے جاتے ہیں۔تو ظاہر ہے اس اصول کو اگر اپنایا جائے تو انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوں گے بلکہ طاقتور اور قابل افراد زیادہ منفعت حاصل کرلیں گے۔

سماجی انصاف کے حصول کا دوسرا طریقہ افراد، جماعتوں اور بالخصوص مرد اور عورت کے درمیان عدل کو یقینی بنایا ہے۔مساوات کے برخلاف عدل کے ذریعہ انصاف کے تقاضوں کو بدرجہ اتم یقینی بنایا جاسکتا ہے۔سماجی عدل میں کمزور، بچھڑوں اور صنف نازک کیلئے خصوصی تحفظات فراہم کئے جاتے ہیں اور سابقہ اور تاریخی ناانصافیوں کا خیال بھی رکھا جاتا ہے تاکہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا جاسکے، اور کمزوروں کو بھی طاقتور کے شانہ بشانہ کھڑا کیا جاسکے۔دوسرے الفاظ میں اعلیٰ انصاف کے حصول کے لئے عدل کے تحت کسی بھی مسئلے کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔

اس کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھا جاسکتا ہے۔اسلام کے نظام وراثت کی بنیاد مساوات کے بجائے عدل پر رکھی گئی ہے۔لہٰذا اس کے تحت مرد کو وراثت میں دو حصہ اور عورت کو ایک حصہ عطا کیا گیا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ اسلام نے عورت کو تمام تر معاشی ذمہ داریوں سے آزاد کرکے یہ ذمہ داریاں مرد کے

کاندھوں پر ڈالدی ہے، یہاں تک اگر بیوی مالدار ہے تب بھی خرچ کی پوری ذمہ داری مرد پر عائد ہوتی ہے۔اسلام نے ایسا صنف نازک کی مخصوص تخلیق اور اس کی فطری ونفسیاتی صلاحیتوں کو مدنظر رکھ کر صنفی عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے کیا ہے۔اب اگر یہاں عدل کے بجائے مساوات کے قانون کو لاگو کیا جائے تو مرد اور عورت کو وراثت میں برابری کے ساتھ ساتھ اسلام کے بہت سارے عائلی اور خاندانی قوانین کو بدلنا لازم آئے گا جو ظاہر ہے مساوات کے علمبردار تو ہوں گے مگر عدل وانصاف کے پیمانے پر پورا نہیں اتریں گے۔لہٰذا یہاں بھی اگر عدالتِ عظمیٰ کی منطق کو قبول کر لیا جائے تو صرف طلاق اور وراثت ہی نہیں بلکہ اسلام کے بہت سارے عائلی اور معاشرتی قوانین اس کی زد میں آئیں گے۔اور شریعتِ اسلامی میں مداخلت کا دروازہ ہمیشہ کے لئے کھل جائے گا۔

بہر حال، طلاق کے اسلامی قوانین کا بغور اور بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان قوانین میں اسلام نے مساوات کے بجائے عدل کے اصول کو مدّ نظر رکھا ہے۔اس میں صنفی تقاضوں کو پورا کرنے کیساتھ ساتھ زماں ومکان کے تغیرات وتقاضوں کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔اسلام ہی کیوں بلکہ فطرت کے تمام مظاہر میں عدل کی نغمہ سنجی نظر آتی ہے کہ اس کا ہر مظہر عدل کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنا ایک الگ اور مخصوص کردار نبھا رہا ہے اور ان تمام مظاہر کے اعلیٰ تال میل سے یہ عظیم الشان کائنات منظم طریقہ سے رواں دواں ہے۔اسی طرح تمام سماجی اور جمہوری ادارے مساوات کے بجائے عدل کے اصول پر کاربند ہیں۔مساوات کے اصول کے تحت تمام عوامی اور پبلک اداروں میں ہر شخص کو تصرف کا حق اگر مساوی طور پر عطا کر دیا جائے تو وہاں سوائے انارکی کے کچھ نہیں رہے گا۔بلکہ عدل کے اصول کے تحت ان اداروں کو چلانے کے لئے قابل اور لائق افراد کا انتخاب کر کے مکمل اختیارات ان کو عطا کئے جاتے ہیں۔حکومت، عدلیہ اور تمام عوامی ادارے مساوات کے بجائے عدل کے نظریہ پر کاربند عمل ہیں۔

حکم صرف اللہ کا

خلاصہ یہ کہ اسلامی قانون ہر دور اور ہر ملک وعلاقے کیلئے یکساں مفید اور ان کی تمام ضرورتوں کو پورا کرنے والا ہے۔اس کے برعکس انسانی قانون چاہے وہ کتنا ہی ترقی یافتہ کیوں نہ ہو اس میں وہ جامعیت اور عالمگیریت نہیں پائی جاتی جو خدائی قانون میں پائی جاتی ہے، کیونکہ انسان کا فہم اور اس کی سمجھ اس کے اپنے مخصوص زمانے اور علاقے کے مسائل تک ہی محدود رہتی ہے۔خود طلاق کی اباحیت کے مسئلہ کو لیں۔طلاق کو قانونی حیثیت یورپ میں انیسویں صدی میں اور بھارت میں ۱۹۵۶ء میں حاصل ہوئی۔جبکہ اسلام نے مرد اور عورت دونوں کو یہ حق ۱۴ صدیاں پہلے ہی دے چکا ہے۔اسی وجہ سے قرآن میں کہا گیا ہے:اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ’’بے شک قانون سازی کا حق صرف اللہ کو ہے‘‘ (یوسف ۴۰ و ۶۷)